اسرائیل غزہ تنازعہ

مسلم دنیا کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے

اکرام بخاری

(مصنف ایک صحافی ہیں۔ جامع میڈیا گروپ کے ایڈیٹر اور ریڈیو پاکستان کے میزبان بھی ہیں۔)

اسرائیل غزہ تنازعہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں، جس کی تاریخی، سیاسی اور مذہبی جہتیں ہیں۔ فلسطینی عوام اور وسیع تر عرب دنیا کے ساتھ مذہبی، ثقافتی اور جغرافیائی سیاسی تعلقات کی وجہ سے مسلم دنیا اس تنازعے میں ایک اہم حصہ رکھتی ہے۔ اسرائیل غزہ تنازعہ کو حل کرنے یا کم کرنے میں مسلم دنیا ممکنہ طور پر کردار ادا کر سکتی ہے، جن میں سے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

سفارتی ثالثی: اسرائیل اور فلسطینی علاقوں دونوں کے ساتھ سفارتی تعلقات رکھنے والے مسلم اکثریتی ممالک ثالثی کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ دونوں فریقوں کے درمیان بات چیت میں سہولت فراہم کر سکتے ہیں، جنگ بندی کے لیے کوششیں کرنے والوں کی مدد کر سکتے ہیں، اور طویل مدتی پرامن حل کی جانب کام کر سکتے ہیں۔

انسانی امداد: مسلم دنیا غزہ کے ان لوگوں کو انتہائی ضروری انسانی امداد فراہم کر سکتی ہے جو اکثر تنازعات کے نتائج سے دوچار ہوتے ہیں، بشمول خوراک، ادویات اور بنیادی ضروریات کی قِلت ہے۔ سعودی عرب، ترکی، قطر، اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک پہلے بھی غزہ کو انسانی امداد فراہم کر چکے ہیں اور یہ جاری رکھ سکتے ہیں۔

فلسطینیوں کی سیاسی حمایت: مسلم ممالک بین الاقوامی پلیٹ فارمز پر فلسطینی کاز کی حمایت کے لیے اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر سکتے ہیں۔ اس میں فلسطینیوں کے حقوق کی وکالت، بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرنے والے اسرائیلی اقدامات کی مذمت، اور فلسطینی ریاست کی حمایت شامل ہو سکتی ہے۔

اقتصادی ترقی اور تعمیر نو: غزہ کی اقتصادی ترقی اور تعمیر نو میں سرمایہ کاری سے زندگی کے سنگین حالات کو کم کرنے اور اس کے لوگوں کو مواقع فراہم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مسلم اکثریتی ممالک غزہ میں بنیادی ڈھانچے کے منصوبوں، روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور اقتصادی ترقی میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔

ثقافتی اور تعلیمی تبادلہ: اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان ثقافتی اور تعلیمی تبادلے کے پروگراموں کو فروغ دینے سے افہام و تفہیم کے پل بنانے اور امن کو فروغ دینے میں مدد مل سکتی ہے۔ مسلم ممالک اس طرح کے تبادلے کو آسان بنا سکتے ہیں اور دونوں اطراف کے لوگوں کے درمیان بات چیت کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔

مذہبی رواداری اور بقائے باہمی کا فروغ: مذہبی رواداری، بقائے باہمی اور باہمی احترام کی اقدار پر زور دینے سے مذہبی تناؤ کو کم کرنے اور زیادہ پُرامن ماحول کو فروغ دینے میں مدد مل سکتی ہے۔ مسلم رہنما اور علما اپنی برادریوں میں ان اقدار کو فروغ دینے اور بین المذاہب مکالمے کی حوصلہ افزائی میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

گمراہ کن انتہا پسندی کا سدِ باب: مسلم اکثریتی ممالک ان گمراہ کن انتہا پسندانہ نظریات سے نمٹنے کے لیے کام کر سکتے ہیں جو تشدد اور تنازعات کو ہوا دیتے ہیں۔ اسلام کی معتدل اور جامع تشریحات کو فروغ دے کر، یہ ممالک انتہا پسندی کا مقابلہ کرنے اور امن کی ثقافت کو فروغ دینے میں مدد کر سکتے ہیں۔

یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ اسرائیل-غزہ تنازعہ کو حل کرنے کے لیے ایک کثیر جہتی نقطہ نظر کی ضرورت ہے جس میں نہ صرف مسلم دنیا بلکہ عالمی برادری، اسرائیل اور فلسطینی قیادت بھی شامل ہو۔ ایک پائیدار حل کے لیے ممکنہ طور پر اس میں شامل تمام فریقین سے سمجھوتہ، بات چیت اور خیر سگالی کی ضرورت ہوگی۔



ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ اب جبکہ اسرائیل بطور ریاست قائم ہو چکا ہے اور اس نے عالمی معیشت میں اپنی گہری جڑیں قائم کر لی ہیں اور دنیا بھر سے اپنے معاشی و سفارتی تعلقات قائم کر لئے ہیں تو اسرائیل کے وجود کو یکسر مسترد کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں اسرائیل صرف چند لاکھ یہودیوں کا مسئلہ نہیں بلکہ دنیا کا مسئلہ بن چکا ہے اور دنیا اپنے معاشی و سماجی تعلقات کی بنیاد پر اسرائیل کو ایک ناجائز ریاست قرار دے کر اسے مسترد نہیں کر سکتی۔ البتہ پاکستان کا معاملہ ذرا مختلف ہے کہ پاکستان کے قیام کے وقت اس مسئلے کی نوعیت کچھ مختلف تھی اور اسلامی دنیا کے جذبات اور احساسات قدرے مختلف تھے تو یہ امکان موجود تھا کہ اسرائیل کو مکمل طور پر مسترد کیا جا سکتا تھا۔ اسی لئے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے دیگر عرب و مسلم ممالک کی سوچ و فکر کے مطابق اسرائیل کو ایک ناجائز ریاست قرار دے کر یکسر مسترد کر دیا تھا

اور اُس وقت بیشتر مسلم ریاستوں بشمول سعودی عرب، عرب امارات سب ایک جیسے مشترکہ موقف پر تھے کی اسرائیل کو غاصب قوت اور ناجائز ریاست قرار دے کر ایک مکمل آزاد فلسطینی ریاست کے ایک نکاتی بیانیہ پر ہی سب متحد و متفق تھے اور پاکستان نے بطور ایک بڑی مسلم آبادی والے ملک کے طور پر اپنا سارا وزن اسلامی دنیا کے موقف کی تائید میں ڈال دیا تھا تاہم بعد ازاں خود عرب ممالک نے پالیسی بدل لی اور عالمی قوتوں سے اپنے مفادات کے حصول کے لئے مسئلے کے دو ریاستی حل جیسی نرم پالیسی اختیار کر لی جو بعد ازاں مزید بدلی کہ کئی مسلم ممالک نے مسئلہ فلسطین حل کیے بغیر ہی اسرائیل سے سفارتی و معاشی تعلقات بھی قائم کر لئے تو اب موجودہ صورتحال یکسر بدل چکی ہے اور اب اسرائیل کے وجود کو یکسر مسترد کرنا ممکن نہیں۔ باقی ہمارے دینی و مذہبی طبقات نے اسرائیل اور یہودیوں کے متعلق دینی حوالے سے ایک ایسے بیانیہ کو عام کیا ہے کہ اب تک ایک عام مسلمان کسی درست اور حقائق پر مبنی بیانیہ کے متعلق زبردست ابہام کا شکار ہے۔ اگر اب تک کے واقعات اور ہونے والی جنگوں اور بدلتے حالات کا گہرائی میں تجزیہ کیا جائے تو مسئلہ فلسطین کو مذہبی یا دینی زاویئے سے دیکھنے کے بجائے اسے خالص ایک سیاسی نکتہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی صورت میں غزہ سمیت سارے فلسطین کو امن نصیب ہو سکتا ہے دوسری صورت میں تمام مسلم ریاستیں ایک بڑی جنگ کے لئے ایک نکتے پر متفق ہوں تب ہی اسرائیل کو اکیم واضح شکست دے کر ایک ایسی فلسطینی ریاست قائم کی جا سکتی ہے جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ اس خطے میں آباد تمام مذاہب کے رہائشیوں کا مشترکہ وطن ہو اور سب ایک آئین کے ماتحت ایک ہی ریاست میں بطور شہری پر امن طور پر رہ سکیں۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ ایسی جنگ کے نتیجے میں فلسطین کی آزادی یقینی ہو نہ ہو سکے البتہ اس کے نتیجے میں مشرق وسطی کا موجودہ نقشہ بھی بدل سکتا ہے۔ جو کسی صورت اُمت مسلمہ کے حق میں نہیں۔ قدرتی دولت اور بیشتر اسلامی دنیا کے لئے ایک ڈھال کی حیثیت رکھنے والی عرب ریاستیں بکھر گئیں تو پوری دنیا میں مسلم ممالک کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اور خدانخواستہ اسلام بطور دین ہی بری طرح متاثر ہو جائے اور رب کی زمین پر رب کا نظام قائم کرنے کی اب تک کی ساری کوششیں ضائع ہو سکتی ہیں لہذا محض مسئلہ فلسطین کی خاطر سب کچھ داو پر لگانا کسی طور بھی مناسب نہیں۔ اسرائیل فلسطین مسئلے کو خالص ایک عالمی سیاسی مسئلے کے طور پر ہی دیکھا اور حل کیا جانا چاہیئے۔ اس حوالے سے اُمت مسلمہ کو ایک مشترکہ موقف اپنانے کی ضرورت ہے۔ اور اب اس مسئلے کو مزید کھلا چھوڑنا بھی منفی نتائج برآمد کر سکتا ہے۔ مسئلے کے حل کی طرف پیش رفت سے ہی دلوں میں اٹھنے والے انتقام کے طوفان کو روکا جا سکتا ہے۔ ورنہ اسرائیل اب تک غزہ میں جو کچھ ظلم و ستم کر چکا ہے اس کے ردِعمل کا خدشہ ہمیشہ موجود رہے گا جو تیسری عالمی جنگ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

اسرائیل-غزہ تنازعہ ایک دیرینہ اور پیچیدہ مسئلہ ہے، اور اس کی مختلف وجوہات ہیں ان وجوہات کو پہلے سمجھنا ضروری ہے عالمی برادری نے تشدد کو روکنے یا دیرپا حل نکالنے کے لیے جدوجہد بھی کی ہے۔ یہاں کچھ عوامل ہیں جو اس چیلنج میں شراکت کرتے ہیں:

تاریخی سیاق وسباق: اسرائیل-غزہ تنازعہ کی گہری تاریخی جڑیں ۱۹ویں صدی کے اواخر اور ۲۰ویں صدی کے اوائل سے جڑی ہیں جو صیہونی



تحریک اور اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی ریاست کے قیام کے ساتھ گہری ہوتی چلی گئیں صیہونی ریاست کی طاقت کے ذریعے غاصبانہ طرزِ عمل اور تشدد کے ظالمانہ رویئے نے ان جڑوں کو مزید گہرا کر دیا۔ ۔تشدد، اور گہری بے اعتمادی، جس سے حل تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔لیکن سب سے اہم مسئلہ وہ اجتماعی مذہبی بیانیہ ہے جس کی وجہ سے نہ صرف ایک فلسطینی بلکہ اُمت مسلمہ کا ہر فرد اسرائیل اور یہودیوں کیخلاف نفرت دل میں پال کر جوان ہوتا ہے اس نفرت پر مبنی مذہبی بیانیہ کو اس وقت مزید تقویت ملتی ہے جب یہودیوں کی طرف سے بھی ایسے ہی اسلام دشمن بیانیہ کی شدت نظر آتی ہے۔ عالمی معیشت پر یہودیوں کی مضبوط گرفت اور معاشی طاقت کے بل بوتے پر نظام عالم پر یہودیوں کی مضبوط گرفت کے نتیجے میں تقریباً بیشتر غیر مسلم ریاستیں اپنے معاشی مفادات کے حصول کے لئے یہودی بیانیہ اور پالیسیوں کی حمایت کرتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں مسلم دنیا میں زبردست بے چینی اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور ایک آگ ہے جو مسلسل سلگتی رہتی ہے اور گاہے بگاہے لاوہ پھٹ پڑتا ہے۔ اس معاملے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اُمتِ مسلمہ میں بطور اُمت اتحاد و یکجہتی کا فقدان ہے اور بیشتر مسلم ریاستوں بالخصوص عرب ریاستوں میں جمہوریت کا فقدان ہے اور بیشتر ریاستیں مطلق العنان بادشاہی نظام سے منسلک ہیں جہاں حکمران اشرافیہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے فیصلے کرتے ہیں جو عوامی امنگوں کے بجائے عالمی طاقتوں کی خوشنودی کے لئے ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اُمتِ مسلمہ بحیثیت مجموعی کمزور ہوتی ہے۔ دوسرا عالمی نظام میں یہودی پالیسیوں کے نتیجے میں مسلم ریاستیں ترقی اور خوشحالی کی طرف تیزی سے آگے نہیں بڑھ پا رہیں اور کمزور معاشی پوزیشن کے ساتھ مسلمان بطور امت اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

جغرافیائی سیاسی مفادات: بہت سے ممالک، خاص طور پر امریکہ جیسی بڑی طاقتوں کے مشرق وسطی میں جغرافیائی سیاسی مفادات ہیں۔ یہ



مفادات اسرائیل غزہ تنازعہ پران کے موقف پراثر انداز ہوتے ہیں اورانہیں اسرائیل کے خلاف سخت اقدامات کرنے سے روکتے ہیں۔

سلامتی کے خدشات: اسرائیل اکثرغزہ میں اپنی فوجی کاروائیوں کے لئے سیکیورٹی خدشات کا بہانا بناتا ہے۔غزہ سے اسرائیل میں جاری راکٹ حملے اورحماس جیسے عسکری گروپوں کی طرف سے لاحق خطرے کی وجہ سے اسرائیلی رہنما حفاظتی اقدامات کوترجیح دیتے ہیں،جس کا نتیجہ بعض اوقات فوجی کاروائیوں کی صورت میں نکلتا ہے۔

بین الاقوامی سفارت کاری: تشدد کوروکنے یا جنگ بندی کی کوششوں کے لیے اکثر بین الاقوامی سفارت کاری اورتعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم، بڑی طاقتوں کے درمیان اختلافات،مسابقتی مفادات،اورتنازع کی پیچیدگی موثر سفارتی کوششوں میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔